تنقید و تبصرہ

مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

طابع و ناشر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ (انڈیا)

جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب ایک عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ نہ صرف اردو اور عربی کے ایک ممتاز اہل قلم و انشا پرداز ہیں، بلکہ عالم اسلام اور بالخصوص عربی دنیا پر ان کی بڑی وسیع اور عمیق نظر ہے۔ نیز حال ہی میں آپ نے یورپ کی سیاحت فرمائی ہے۔ ان تمام خصوصیات پر مستزاد یہ کہ موصوف ایک صاحبِ دعوت بزرگ ہیں۔ اور ان کی مخاطب بالعموم ساری اسلامی دنیا ہوتی ہے۔ زیر نظر کتاب بھی آپ کی اسی دعوت کی ایک کڑی ہے۔ اصل کتاب عربی میں تھی۔ اس میں کافی اضافہ کر کے اسے اب اردو قالب میں پیش کیا گیا ہے۔

آج کل اکثر و بیشتر مسلمان ملکوں میں قومیت، تجدد پسندی اور مغربی تہذیب کو اپنانے کی جو تحریکیں چل رہی ہیں، مصنف نے اس کتاب میں بڑی تفصیل سے ان کا جائزہ لیا ہے، اور ان تحریکوں کے قائدین کی تقریروں و تحریروں کے اقتباسات دے کر بتایا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں کیا سوچتے اور کیا کرتے ہیں۔ اور اپنی اپنی قوموں کو وہ کس طرف لے جانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ مصنف نے یہ حالات و واقعات بیان کر کے ان سے جو نتائج نکالے ہیں، ان کے بارے میں موصوف سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن انہوں نے ان ملکوں کی موجودہ صورت حال کی جو تصویر پیش کی ہے، وہ بہت حد تک صحیح اور مبنی بر حقیقت ہے اور اس سے دنیائے اسلام کی اس کشمکش کو سمجھنے میں بڑی مدد

ملتی ہے، جو اس وقت وہاں اسلامیت اور مغربیت میں برپا ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں جب عالم اسلام کو مغربی تہذیب کا سامنا کرنا پڑا تو اس وقت بقول مصنف کے یہ تہذیب "تازہ دم، زندگی اور نشاط، حوصلہ و عزم اور ترقی و وسعت کی صلاحیت سے بھرپور" تھی اور اس کی مستحق تھی کہ اس "کا شمار تاریخ انسانی کی طاقتور ترین اور وسیع ترین تہذیبوں میں کیا" جاتا۔ لیکن "اس تہذیبی مجموعہ میں ناقص اجزا بھی تھے اور مکمل بھی۔ مضر بھی اور مفید بھی۔ صحیح بھی اور غلط بھی۔۔۔۔"

دنیائے اسلام کے لئے جو ظاہر ہے اس وقت سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، ذہنی اور بہت حد تک روحانی زوال کے نرغے میں تھی، مغربی تہذیب کی اس یلغار نے بڑی نازک صورت حال پیدا کردی تھی۔ مصنف کے نزدیک اس کا ردعمل تین طرح ہوا۔ ایک تو منفی اور سلبی رویہ تھا۔ یعنی یہ کہ "عالم اسلام اس تہذیب کے سارے نتائج اور فوائد کا یکسر انکار کردے اور اس کی کوئی اچھی بُری بات سننے کا روادار نہ ہو، ۔۔۔۔ اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھائے نہ ان علوم کو ہاتھ لگانے پر تیار ہو، جن میں اہل مغرب کو تفوق و امتیاز حاصل ہے ۔۔۔"
مصنف نے سعودی عرب افغانستان اور یمن کی مثالیں دے کر بتایا ہے کہ انجام کار یہ سلبی رویہ کتنا مضرت بخش ثابت ہوا۔ اور اس تفریط کا نتیجہ آج کس قسم کی افراط میں نکل رہا ہے۔

مثال کے طور پر ایک زمانے میں سعودی عرب میں مغرب سے ہر آوردہ چیز سے انتہائی نفرت کی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض نجدی قبائل کو ٹیلیفون کی "بدعت" تک گوارا نہ تھی اور ان میں سے ایک مشہور قبیلے غط غط نے تو سلطان ابن سعود کی ان "بدعات" سے مشتعل ہو کر بغاوت بھی کردی تھی۔ لیکن مصنف کے نزدیک "اب سعودی حکمراں خاندان پہلے زمانے کے صحرا میں حکومت کرنے والے وہابی شیخ کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ وہ معاشرتی شان و شوکت کے ساتھ ہر قسم کے سامان عیش و راحت کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں ۔۔۔ جس جوش و خروش کے ساتھ کسی زمانے میں وہابی قبائل نے اسلام کے بنیادی اصول کا دفاع کیا تھا۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے جس سادگی پر زور دیا تھا وہ اب بالکل غائب ہے۔ اب غیر ملکی سامان تعیش کے خلاف تہدید آمیز احتجاج نہیں ہوتے۔ آج ان سب کو نہ صرف تسلیم کر لیا گیا ہے، بلکہ سوسائٹی کے سب ہی طبقے ان کو حاصل کرنے میں

کوشاں نظر آتے ہیں (ایک امریکی کتاب سے اقتباس)

اسی طرح قدامت پسندی اور مغربیت سے نفرت میں افغانستان بھی سعودی عرب سے پیچھے نہ تھا۔ لیکن اب بقول مصنف کے "ٹائمز آف انڈیا" کے ایک یورپین نامہ نگار کے الفاظ میں :-

"..... افغانستان میں عورتوں نے اگست ۱۹۵۹ء سے بے نقابی شروع کی ہے۔ ایک شاہی فرمان کی رو سے عورتوں کو برقع سے باہر نکلنے کا حکم تو نہیں دیا گیا، لیکن اجازت دے دی تھی۔ میں نے کابل یونیورسٹی کی ایک میڈیکل انڈر گریجویٹ، زندگی اور زندہ دلی کی مجسم تصویر مساۃ معصومہ کاظمی سے پوچھا کہ تم نے (اس فرمان کے اجراء کے بعد) کیا کیا؟ اس نے جواب دیا کہ میری بہن اور میں نے اپنی برقع کی چادروں کو نذر آتش کر دیا اور ہم نے قسم کھائی کہ اب کبھی برقع اور چادر نہ استعمال کریں گی ... آج افغانستان کی یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم جاری ہے، جہاں پہلے طالبات چادر اوڑھ کر آنے اور طالب علموں سے علیحدہ پڑھنے کی عادی تھیں۔"

مصنف فرماتے ہیں :- "قریب قریب یہی یمن اور ان تمام ممالک کا حشر ہوتا نظر آ رہا ہے۔ جنہوں نے عرصہ تک نئی چیزوں کا انکار کیا۔ اور مفید علوم، بے ضرر وسائل، نئے تنظیمی تجربوں، رفاہی تدابیر اور فوجی اسٹیٹ کا مات کو بھی اپنے حدود میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی تھی۔"

جب دنیائے اسلام کے ان سب سے بڑھ کر قدامت پسند اور مغربیت بیزار ترین ملکوں میں تجدد پسندی کی لہر اس زور شور سے اٹھ رہی ہے، تو جہاں انیسویں صدی عیسوی کے اوائل ہی سے مغربیت کا اثر و نفوذ شروع ہو چکا ہے، وہاں یہ تجدد پسندی کس انتہا کو پہنچ چکی ہوگی، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

دوسرا موقف مصنف کے الفاظ میں "شکست خوردگی، مکمل سپردگی اور ایک عقیدت مند اور سرگرم مقلد اور ایک ایسے ہونہار و سعادت مند شاگرد کا ہے جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچا، اور وہ یہ ہے کہ عالم اسلام کا کوئی حصہ اس مادی، مشینی اور اپنا مخصوص مزاج و ذہن رکھنے والی تہذیب کو جوں کا توں قبول کرے اور اس کے سارے بنیادی عقائد، فکری رجحانات، مادی افکار و خیالات اور سیاسی و اقتصادی نظام پر ایمان لے آئے..."

مولانا سید ابوالحسن علی فرماتے ہیں کہ "اس طرزِ فکر اور طریقہ کار کا سب سے پہلے ترکی میں تجربہ کیا گیا" اور اب ایک ایک کرکے جو مسلمان ملک بھی آزاد ہوتا ہے، وہ ترکی ہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ ترکی میں اس طرز فکر اور طریقہ کار کا کس طرح تجربہ کیا گیا۔ مصنف نے بڑی تفصیل سے اسے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے نامق کمال اور ضیا گوک الپ جیسے اہل فکر و قلم اور اتا ترک جیسے عملی آدمی کے اقوال و اعمال پر روشنی ڈالی ہے اس کے بعد ایک ایک کرکے دوسرے مسلمان ملکوں میں اس ضمن میں جو انقلابات ہو رہے ہیں، ان کا ذکر کیا ہے۔

اسلامیت اور مغربی تہذیب کی اس کش مکش نے ہندوستان میں جو شکل اختیار کی، اسے بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ یہاں اس سلسلے میں "دو قسم کی قیادتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ پہلی قیادت دینی قیادت تھی، جس کے علمبردار علمائے دین تھے، دوسری قیادت کے علمبردار سرسید احمد خاں، ان کے حلقہ بگوش اور جدید مکتب خیال کے افراد تھے"۔ مصنف کے نزدیک جہاں تک علمائے کرام کا تعلق تھا، انہوں نے خیر اسی میں سمجھی کہ وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ جائیں، اور اس طرح "اسلامی زندگی کے مظاہر اور اسلامی تہذیب کے جتنے بچے کھچے آثار باقی رہ گئے ہیں، ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں"۔ موصوف کے الفاظ میں دیوبند اس رجحان کا علمبردار اور ہندوستان میں اسلامی ثقافت و تہذیب کا سب سے بڑا مرکز تھا"

دوسری قیادت کا علم سید احمد مرحوم نے بلند کیا۔ وہ مصنف کے نزدیک "مغربی تہذیب اور اس کی مادی بنیادوں کی تقلید اور جدید علوم کو اس کے عیوب و نقائص کے ساتھ اور بغیر کسی تنقید و ترمیم کے اختیار کر لینے کے داعی تھے" اسی ضرورت کے تحت انہوں نے اسلام اور قرون کی انیسویں صدی کے آخر کے سائنسی معلومات اور مغربی تمدن کے معیاروں کے مطابق قرآن کی توجیہ کی۔ سرسید کے اس "تقلیدی رجحان" کے خلاف جو ردّ عمل ہوا، مصنف کے خیال میں اس کے فکری قائد اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال تھے، اور عملاً اس ردّ عمل نے خلافت تحریک اور بعد میں تحریک پاکستان کی شکل اختیار کی۔ ظاہر ہے مصنف کے اس خیال سے اتفاق کرنا بڑا مشکل ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ مشکل ان کے اس خیال سے اتفاق کرنا ہے۔ چوں کہ پاکستان کے عائلی قانون میں بعض اصلاحات کی گئی ہیں، اس کی وجہ سے بقول ان کے پاکستان

اپنے بنیادی مقاصد سے انحراف کا مرتکب ہوا ہے۔ لیکن شاید مصنف اس سے واقف نہیں کہ پاکستان تحریکِ مسلم لیگ کا حاصل ہے۔ اور اگر مصنف مسلم لیگ کی پوری تاریخ اور اس کی سیاسی جد و جہد کی نوعیت کو ملحوظ نظر رکھتے تو وہ اس قسم کا فیصلہ نہ دیتے۔ افسوس ہے کہ جس طرح وہ ترکی، ایران، مصر اور دوسرے مسلم ممالک کی سیاسی و معاشرتی تبدیلیوں کا سراغ لگاتے وقت اکثر سطحی باتوں میں الجھ کر رہ گئے، یہی کیفیت ان کی پاکستان کے متعلق بھی ہے پاکستان پر فردِ جرم لگاتے وقت ان کے سامنے تحریک پاکستان کی "تاریخ اور اس کی قیادت کی صحیح تصویر ہونی چاہیئے تھی، پاکستان سر سید کے مکتب فکر کا ردِ عمل نہیں، بلکہ وہ ردِ عمل ہے اس مکتب فکر کا، جو نئے زمانے، اس کی ضرورتوں اور اس کے تقاضوں سے آنکھیں بند رکھنے کا داعی تھا۔ اور گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں انگریزی عمل داری کی وجہ سے اس برصغیر میں جو سیاسی معاشرتی اور اقتصادی تغیرات رونما ہو چکے تھے، ان کو اپنانے سے انکار کرتا تھا۔

مصنف فرماتے ہیں کہ ہندوستان کی اوپر کی دو تیادتوں کے علاوہ اسی زمانے میں ندوۃ العلماء کی فکری تحریک بھی ابھری "اور اس کے قائم کردہ دارالعلوم میں اس کی صلاحیت تھی کہ وہ اسلامی اور مغربی ثقافت اور علمائے دین و جدید طبقے کے درمیان پل کا کام کر سکے، اور ایک ایسا متوازن فکر تیار کر سکے، جو قدیم و جدید دونوں کے محاسن کا جامع ہو....."
لیکن خود انہی کے الفاظ میں۔

"اس تحریک کو قدیم و جدید دونوں طبقوں کا (اس وسیع خلیج کی وجہ سے جو ان کے درمیان حائل تھی) وہ ضروری تعاون حاصل نہ ہو سکا جس کی وہ مستحق تھی....."

چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ "قوم کا ایک بڑا حصہ ان دونوں طبقوں کے درمیان ہچکولے کھاتا رہا جس میں ایک طبقہ قدیم طرز تعلیم اور مسلک سے سرِمو انحراف ایک قسم کی تحریف بدعت سمجھتا تھا، دوسرا طبقہ مغرب سے ہر آنے والی چیز کو عظمت و تقدیس کی نگاہ سے دیکھتا اور اس کو ہر عیب اور نقص سے پاک سمجھتا تھا.....ان دو طبقوں کے درمیان فکر و معیار کا جو تضاد تھا' اور جس طرح وہ انتہائی سروں پر تھے اس کی تصویر لسان العصر اکبر الہ آبادی نے اس شعر میں کھینچی ہے:

ادھر یہ ضد ہے کہ لمنڈ بھی چھو نہیں سکتے
ادھر یہ رٹ ہے کہ ساقی صراحی مے لا"

مصر میں انیسویں صدی کے اوائل سے جس طرح مغربی تہذیب کا اثر و نفوذ شروع ہوا اور اب جمال عبدالناصر کے دور اقتدار میں اس نے عرب قومیت اور عرب اشتراکیت کی جو ہئیت اختیار کی ہے، مصنف نے بڑی تفصیل سے اسے قلم بند فرمایا ہے۔ اسی طرح شام و عراق کی مشہور سیاسی پارٹی حزب البعث کے اغراض و مقاصد کے (شام میں اب بھی اور عراق میں اس سے پہلے اس پارٹی کی حکومت تھی) نہایت دلچسپ اقتباسات دیئے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایران، ٹیونس، الجزائر اور انڈونیشیا کے حالیہ تغیرات پر بھی تبصرے ہیں اور ان کے حکمران طبقوں کی تجددپسندی پر سخت تنقید کی گئی ہے۔

اس بارے میں مصنف کو شکایت یہ ہے کہ ان مسلمان ملکوں کے قائدین کو جب ضرورت ہوتی ہے تو وہ مسلمان عوام کے اسلامی جذبے سے اپیل کرتے ہیں، لیکن جب جنگ ختم ہو جاتی ہے اور اقتدار کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں آ جاتی ہیں تو وہ قومی و وطنی نعرے دہرانے شروع کر دیتے ہیں۔ موصوف کی یہ شکایت بظاہر بے محل نظر نہیں آتی، لیکن شاید وہ یہ نہیں جانتے کہ عوام کے مقابلے میں قائدین کی ذمہ داری کچھ زیادہ ہوتی ہے، انہیں ایک ملک کو آزاد کرانے کے بعد اس کا نظم و نسق چلانا پڑتا ہے، اس میں امن عامہ قائم کرنا ہوتا ہے، پھر یہ کہ ان عوام کے لئے روزگار، زندگی کی بنیادی ضروریات، ان کے لئے تعلیم۔ طبی امداد اور اس طرح کی ہزاروں چیزوں کا انتظام کرنا پڑتا ہے اور یہ چیزیں محض نعروں سے حاصل نہیں ہو سکتیں عوام اور قائدین اور سپہ اور سپہ سالار میں یہی فرق ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے وقتی جذبات اور ہنگامی نعروں کی سطح پر زندگی کے ٹھوس حقائق کو دیکھنے کی اس کتاب میں زیادہ تر کوشش کی گئی ہے، اور منطقی و سائنٹفک استدلال کے بجائے اکثر ناصحانہ و داعیانہ انداز کو مقدم رکھا گیا ہے۔ نیز اس امر کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے کہ مسلم ممالک کی موجودہ قیادتوں کو اپنے ہاں کی معاشرتی پس ماندگی، افلاس، بے کاری، جہالت، ذہنی انتشار اور جمود و مردہ دلی کو ختم کرنے میں جو مشکلات پیش آ رہی ہیں، ان کا جائزہ لیا جاتا، اس راہ کی دقتوں کا ذکر ہوتا، اور یہ قیادتیں جو کچھ کر رہی ہیں۔ ان کی مجبوریاں بتائی جاتیں، لیکن افسوس ہے مصنف نے سارا زور اپنے مفروضات پر دیا ہے، اور انہیں رنگین سے رنگین تر بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور شاید اس معاملے میں وہ معذور ہوں۔ کیونکہ ان کا بنیادی فکر ہی کچھ ایسا ہی ہے، کتاب کے ص ۲۲۶ پر وہ فرماتے ہیں:—

"یہ بے شک صحیح ہے کہ مسلمان ممالک مادی ساز و سامان کے اعتبار سے فقیر ہیں۔ کمزور و نہتے ہیں۔ علم و صنعت کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں سیاست اور اقتصادی حالت میں اور قوموں کو نہیں پہنچتے۔ ان چیزوں میں ان میں اور اقوام مغرب میں صدیوں اور قرنوں کا فرق ہو گیا ہے۔ اور بڑی حد تک یہ ضروری بھی ہے کہ یہ چیزیں ممالک اسلامیہ کے قائدین و زعماء کے فکر و اہتمام کا موضوع بنیں اور یہ باتیں خاص توجہ و التفات کی مستحق ہیں۔"

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

"لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان رہنماؤں کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہ اس کے بغیر بھی دنیا میں عظیم طاقت ہیں۔ ان کے پاس وہ پیغام دعوت اور وہ دین ہے جو انسانیت کی غذا اور اس کی روح ہے۔"

اس لئے موصوف کے نزدیک "..... مسلمانان عالم مغرب کے ان علوم و فنون اور ان کی ایجادات و صناعات کے اتنے محتاج و ضرورت مند نہیں، جتنا مغرب ان کے ایمان و یقین کا محتاج ہے۔"

ایک تو مصنف کی یہ رائے کہ مسلمان ممالک فقیر اور کمزور و نہتے ہونے اور علم و صنعت کی دوڑ دوڑ میں بہت پیچھے رہ جانے کے بغیر بھی دنیا میں عظیم طاقت ہیں۔" کچھ خود فریبی سی معلوم ہوتی ہے اور دوسرے یہ سمجھ لینا کہ ہمارے پاس جو دین ہے اس پر جیسی یہاں چند افراد کا نہیں بلکہ مسلمان قوموں کا بحیثیت مجموعی سوال ہے) وہ ایمان و یقین حاصل ہے کہ اس کی وجہ سے مغرب ہمارا محتاج ہے نہ کہ ہم مغرب کے علوم و فنون اور ایجادات و صناعات کے محتاج ہیں۔ اور اسے ہماری زیادہ ضرورت ہے، حقیقت واقعی سے بہت دور ہے اس قسم کا نقطۂ خیال جو اس کتاب کا اساسی نکتہ ہے، عام طور سے غلط قسم کی آسودہ خاطری اور دل جمعی پیدا کرتا ہے۔ اور اس سے ہمیں اپنی کمزوریاں اور کوتاہیاں تو نظر نہیں آتیں البتہ ہم خواہ مخواہ پندار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے اس کتاب کو پڑھ کر قاری پر مجموعی تاثر یہی ہوتا ہے اور ہمارے نزدیک یہ کوئی صحت مند چیز نہیں، اس کی وجہ سے جس جس اعلیٰ مقصد کی خاطر یہ کتاب لکھی گئی ہے وہ پورا ہونا مشکل ہے۔

کتاب مجلد ہے

ضخامت ۲۶۰ صفحات، قیمت پانچ روپے